امریکہ اور اسلامی دنیا

پی ڈبلیو سنگر*

ترجمہ: توراکینہ قاضی

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے دہشت گردانہ حملوں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والے ان کے ردعمل سے امریکی خارجہ پالیسی کے لیے انتہائی گہرے اور سنجیدہ نوعیت کے سوالات کا سلسلہ ابھر آیا ہے۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے چیلنج ـــــ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور مشرق وسطیٰ امن کے عمل میں امریکی کردار سے لے کر بہتر پبلک ڈپلومیسی تک ـــــ آئندہ سالوں میں بین الاقوامی معاملات کا مرکز بنے رہیں گے۔ بدقسمتی سے ان موضوعات سے نمٹنے کے لیے ٹھوس فیصلے ابھی تک نہیں کیے گئے۔

۲۰۰۲ء کے سال نے نہ صرف افغانستان میں امریکہ کی فتح یابی کا نظارہ کیا ہے بلکہ امریکہ اور وسیع اسلامی دنیا (اس میں نہ صرف شرقِ اوسط شامل ہے بلکہ دوسرے اسلامی ممالک اور افریقہ و یورپ اور سابق سوویت یونین کی وسط ایشیائی ریاستیں، جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور اس سے آگے کی ریاستیں بھی شامل ہیں) کے مابین تناؤ کی کیفیت عمیق سے عمیق تر ہوتے بھی دیکھی ہے۔ اکثر اسلامی ممالک میں سروے کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام میں امریکہ مخالفت جذبات خاصے تسلسل سے پائے جاتے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ میں جاری تشدد سے یہ جذبات اور بھی شدید ہو گئے ہیں۔ تشکیک اور تنفر سے، طرفین کی دلچسپیاں اور دشمنیاں ایک ہونے کے باوجود، باہمی تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس بد سے بدتر ہوتی ہوئی صورت حال میں بہت سے ایسے مخمصے نظر آتے ہیں جو اسلامی ممالک اور تحریکات کے بارے میں امریکی خارجہ پالیسی میں بار بار در آتے ہیں۔ پہلا مخمصہ بالخصوص ریاستی سطح پر

* P.W. Singer, "America and the Islamic World", *Current History*, November, 2002, pp. 355-364.

ہے۔ امریکہ کو اب اسلامی دنیا میں ان سخت گیر حکومتوں کے ساتھ، جو اسلامی دنیا میں اس کے اتحادی سمجھے جاتے ہیں، کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ ایسا ردّیہ جو ایک تبدیل ہوتے ہوئے پرخطر ماحول میں امریکہ کے اسٹریٹجک مفادات اور اقدار کے تحفظ کا باعث بنے۔ دوسرا مخمصہ بین الریاستی سطح پر ہے جو پہلے مسئلے ہی کی ضمنی پیداوار ہے۔ امریکہ کو اپنے دوست اور اتحادی ممالک میں موجود سول سوسائٹی، اپوزیشن جماعتوں اور دیگر اسلام پسند گروہوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ تیسرا مخمصہ دوستیوں کے مابین توازن کا ہے۔ مسلم ممالک اور تحریکوں کے ساتھ ساتھ مثبت تعلقات جاری رکھتے ہوئے امریکہ اسرائیل کے ساتھ اپنا قریبی اتحاد کیسے برقرار رکھ سکتا ہے؟ چوتھا مخمصہ یہ ہے کہ امریکہ کس طرح مسلم اقلیتوں کے مسائل اور معاملات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے (بالخصوص وہ جو اتحادی ممالک میں رہتی ہیں)۔ پانچویں مخمصے کی نوعیت جغرافیائی و سیاسی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا مثالی معیار کیا ہو سکتا ہے جس سے دیگر مقاصد اور اقدار پر کسی سمجھوتے کے بغیر راہنمائی مل سکے؟۔

ان میں سے ہر مخمصہ ایک مشکل طریق عمل کا سوال ہے، جو مختلف اسلامی خطوں کی داخلی پیچیدگیوں کے مختلف بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ بحیثیت مجموعی ان مخمصوں نے امریکہ کے اسلامی ریاستوں اور تحریکوں کے ساتھ موجودہ روابط کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ جب تک ان مسائل کو حل کرنے کے لیے موزوں حکمت عملیاں نہ وضع کی جائیں گی، یہ اسلامی دنیا میں امریکہ کے مقام اور ساکھ کی آئندہ کئی نسلوں تک بیخ کنی کرتے رہیں گے۔

اسلامی دنیا میں امریکی مفادات اور امریکی پالیسی

امریکہ کے اسلامی دنیا میں جو محدود مقاصد ہیں، وہ پہلے مخمصے کی صورت گری کرتے ہیں۔ گزشتہ کئی عشروں سے امریکہ کی اسلامی دنیا بالخصوص شرقِ اوسط کے بارے میں جو پالیسی رہی ہے وہ ایک اہم ''سودے بازی'' (bargain) کے گرد گھومتی رہی ہے۔ جب تک استحکام اور امریکی اسٹریٹجک مفادات (سرد جنگ میں اشتراکیت کے خلاف مدد یا توانائی کے محفوظ و مضبوط بہاؤ کی یقین دہانی) پورے ہوتے تھے، امریکہ جوں کی توں صورت حال (status quo) کا حامی رہا اور اس نے

اسلامی ریاستوں میں سیاسی اور معاشی اصلاح کے کام کو آگے بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ یہ تصور یا طرزِ عمل کئی کلیدی مفروضات پر منحصر تھا مثلاً تعلقات کے لیے صرف حکومتیں ہی اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ اور یہ حکومتیں جو سراسر مطلق العنان آمروں کی حکومتیں تھیں، وہ اس ''سودے بازی'' کی تکمیل میں اپنا حصہ ڈالنے پر رضامند بھی تھیں اور وسائل بھی رکھتی تھیں۔

گیارہ ستمبر کے بعد سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ آیا ان حملوں نے یہ سودے بازی ختم کر ڈالی ہے؟ دہشت گردی کے نئے خطرات کے ظہور سے نہ صرف امریکی اسٹریٹیجک مفادات تبدیل ہو گئے بلکہ یہ بھی سامنے آ گیا کہ مطلق العنان حکومتیں دوسرے بہت سے بڑے اہم کرداروں کے درمیان محض ایک کردار ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ جابر حکومتیں اپنے طور پر باہمی سمجھوتے کی پاسداری کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی بجائے (ہوا یہ کہ) امریکی امداد جوان جابر حکومتوں کو ملی، اس کا منفی ردعمل ہوا اور امریکہ کے لیے خطرات میں اضافہ ہو گیا۔ یہ حقیقت صرف مشرقِ وسطیٰ ہی میں سامنے نہیں آئی بلکہ دیگر اسلامی ممالک مثلاً پاکستان میں بھی واضح ہوئی ہے۔

اسلامی دنیا میں ریاست کی عمومی ناکامی اس بدنظمی میں مرکزی مقام رکھتی ہے۔ ایک صحت مند ریاست کا تصور جو اس قابل ہو کہ اچھی حکومت دے سکے (جو عوامی خدمات مہیا کرنے والی ہو، جو اپنے لوگوں کو تحفظ دے سکے اور انہیں صحت مند، تعلیم یافتہ اور خوشحال بنائے اور معاشی ترقی کی ضامن ہو) اسلامی دنیا میں تقریباً اجنبی ہے۔ اس کے بجائے حکومت کا جو نمونہ ہر جگہ دکھائی دیتا ہے وہ ایک شکستہ حاکمیت ہے جو اپنے حواریوں پر مشتمل ہوتی ہے اور عوامی فلاح و بہبود میں کم ہی دلچسپی لیتی ہے۔

اسلامی دنیا کے بیشتر ممالک پر مطلق العنان جابر حکومتیں مسلط ہیں، جنہیں اپنے عوام کی کوئی نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ پچھلے کئی عشروں میں آزادی اور جمہوریت کی عالمگیر تحریک نے قابلِ ذکر پیش رفت کی ہے، تاہم اسلامی دنیا اس سفر میں بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ مسلم اکثریتی ممالک کا پانچواں حصہ جمہوری ریاستوں پر مشتمل ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ جو اسلام کے اصل مراکز ہیں اور جن کے پاس تیل اور اس کی فروخت سے حاصل شدہ دولت کا اثر اور قوت بھی ہے، ان میں سے ایک ریاست میں بھی منتخب حکومت کا کوئی وجود نہیں۔ (لبنان ایک ممکنہ استثناء ہو سکتا ہے لیکن بہت سی نسلی و مذہبی بنیادوں پر کوٹوں

(quotas) اور شام کے اثر سے یہاں بھی آزادی اور جمہوریت نامکمل اور غیر مؤثر ہے)۔ نتیجتاً اسلامی دنیا میں باقی دنیا کے مقابلے میں استبداد و استحصال کی سطحیں بلند اور انسانی حقوق کی سطحیں پست ہیں۔

اس قسم کی ناکامیوں سے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومتوں کے قانونی جواز کو کس طرح پرکھا جاسکتا ہے؟ گزشتہ چوتھائی صدی میں اکثر اسلامی ممالک میں معیار زندگی فی کس آمدنی کے حساب سے کافی نیچے گرا ہے یا پھر جوں کا توں چلا آ رہا ہے۔ بہت کم ممالک میں فوج اور عوام کے مابین مثبت تعلقات ہیں اور مسلم اکثریتی ممالک کے مقامی مبصرین شاذ ہی اپنی خارجہ پالیسیوں کو مثالی قرار دیتے ہیں۔ یقیناً عالمی پیمانہ خوشحالی کے اعتبار سے یہ مشکل ہوگا کہ کسی اسلامی ریاست کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے ایک کامیاب نمونہ کے طور پر شناخت کیا جاسکے۔

اس سابقہ کارکردگی نے معاشرے میں اندرونی کھنچاؤ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ اکثر مسلم ممالک میں حکومتیں عوام کی مرضی سے اقتدار میں نہیں آئیں (بیشتر تو ایک نسل قبل فوجی انقلابات کے ذریعے اقتدار میں آئیں)۔ ان حکومتوں کی اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکامی پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو ان کے لیے اپنے اقتدار کا جواز پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں بڑھتی ہوئی آبادی اور انحطاط پذیر اقتصادیات صورت حال کو بد سے بدتر بنا کر بنا رہی ہیں۔

بہت سی اسلامی حکومتوں کو اس طرح شدید قسم کے اندرونی دباؤ کا سامنا ہے لیکن ان کے پاس سوائے اس کے کوئی علاج موجود نہیں کہ وہ جبر و تشدد کے آلات استعمال میں لائیں۔ چنانچہ اس ریاستی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان ملکوں میں انقلابی گروہ خوب نشوونما پا رہے ہیں۔ کئی مسلم ممالک کو دہشت گرد گروہوں سے کئی شدید نوعیت کے چیلنجوں کا سامنا ہے، مثلاً القاعدہ اور مصری اسلامی جہاد (یہ دونوں ملک بدر ہونے کے بعد باہم متحد و مربوط ہو گئے ہیں)۔ ان کو پوری طرح سے کچلنے میں ناکام ہونے پر انہیں دوسرے ملکوں کو برآمد کر دیا گیا۔ اپنی جلاوطنی کے بعد ایسے اکثر گروہوں نے اپنی بندوقوں کا رُخ امریکہ کی طرف کر لیا کہ یہی ان کے خیال میں وہ بنائے فساد ہے جس نے مقامی حکومتوں کے اقتدار کو تحفظ دے رکھا ہے۔

ریاست کی عمومی ناکامیاں بھی عوامی غیظ و غضب میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں اور اکثر اس کا رُخ

امریکہ کی جانب ہی ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو امریکہ کو اپنے ملکوں میں جاری صورت حال (status quo) کے سرپرست کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جو ایک عام مسلمان کی کسی توقع پر پورا نہیں اترتا۔ ان کے غیظ وغضب کا ہدف موجودہ سیاسی نظام ہے جسے امریکہ کی تائید وحمایت حاصل ہے اور جس پر وہ اثر انداز نہیں ہو سکتے لہٰذا ایک قسم کی اہانت کا احساس ہر دم ان کی زندگیوں میں موجود رہتا ہے۔ چونکہ فلسطینی مسئلہ پر (خصوصاً شرقِ اوسط میں) سیاسی اظہارِ رائے کی اجازت ہے، اس لیے یہ عوام کے احساسِ اہانت اور غیظ وغضب میں اور بھی اضافہ کرتا ہے اور اکثر ایک ایسا میدان بن جاتا ہے جس میں مخالفین اپنی ہی حکومتوں کو ہدف ملامت وتنقید بنانے لگتے ہیں۔

یہ حرکیاتی عمل اس امریکی خارجہ پالیسی کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ آزادی، حقوق انسانیت اور جمہوریت کی علمبردار ہے۔ یہ پالیسی عمومی طور پر بیشتر اسلامی ممالک کے مقامی تجربہ سے مختلف ہے اور امریکہ کو ایک مستبد حکومت کے محافظ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ نتیجتاً امریکہ کے دوہرے معیار پر ہر جگہ شدید تنقید ہوتی ہے جو کہ اس قسم کی ''سودے بازی'' کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا میں بیشتر لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ امریکہ خواہ بیرونی ممالک میں کچھ اصولوں کی ترویج کے لیے کوشش کرے وہ اکثر ان کی حمایت نہیں کرتا۔ اس کی بجائے وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ (امریکہ) انتہائی خود غرضانہ انداز میں اپنے ہی قومی مفادات کے تعاقب میں رہتا ہے۔

اسلامی دنیا کی یہ عمومی علیحدگی اور حکومتی احتساب اور سیاسی ومعاشی ناکامیاں گیارہ ستمبر کے حملوں کا باعث بنیں۔ اس کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں سنسنی خیز ردعمل ظاہر ہوئے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ خواہ امریکہ اس قابل بھی ہو کہ وہ القاعدہ کے لیڈروں کو پکڑ لے یا مار ڈالے پھر بھی زیر سطح حالات جنہوں نے ان گروہوں کی پیدائش ونمو اور ان کی ہر دلعزیزی میں آسانیاں پیدا کیں —— یعنی سیاسی استبداد اور اقتصادی حاشیہ بندی —— یہ سب اپنی جگہ برقرار رہیں گے۔ اب ممکن ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی میں اصلاحِ احوال کو ترجیح ملے تو یہ اسلامی حکومتوں حتیٰ کہ مستبد ترین حکومتوں کے مفادات میں بھی بہترین ثابت ہوگی۔ اگر یہ حکومتیں زندہ رہنا چاہتی ہیں تو ان کے لیے سیاسی تبدیلی ناگزیر ہوگی تاکہ موجودہ اور روز افزوں دباؤ کا جواب دیا جا سکے۔

یہاں ایک شرانگیز چکر تخلیق کیا گیا ہے جس سے جابر حکومتیں، جدیدیت کے مخالف مذہبی گروہ، بڑھتی ہوئی غربت اور ناامیدی جیسے عناصر آپس میں ایک دوسرے کے مدد و معاون بنے ہوئے ہیں۔ پالیسی سازی کے لیے بھاری بھرکم چیلنج یہ ہے کہ اس چکر کو کس طرح ختم کیا جائے کہ امریکہ کے مفادات کو بھی گزند نہ پہنچے۔ اس سے وہ مسئلہ ابھرتا ہے جس سے امریکی پالیسی سازوں اور اسلامی دنیا میں ان کے مماثل لوگوں کی طرف سے اکثر چشم پوشی کی جاتی ہے، اور وہ ہے نفاذِ جمہوریت۔ اگر غیر شفاف ہونا اور آزادی کی کمی اس مسئلہ کی جڑ ہے تو پھر نفاذ جمہوریت واحد راستہ ہے جس پر چل کر اسلامی معاشروں کی بنیادی تنہائی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی تانے بانے کو زیادہ نمائندہ خطوط سے جوڑ کر نفاذِ جمہوریت سے ہی اسلامی دنیا کے ان تکلیف دہ مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ نفاذِ جمہوریت کے لیے امریکی تائید وحمایت اس کے مسلم ریاستوں کے ساتھ زیادہ مضبوط اتحاد قائم کرنے میں مدد ثابت ہوگی۔ اور یہ ان پائیدار شراکتوں میں، جو امریکہ نے مغرب، مشرقی یورپ اور مشرقی ایشیا میں قائم کر رکھی ہیں، توازن پیدا کرے گی۔

جمہوریت کی پیش رفت کا مطلب ہے امریکہ کئی دہائیوں کی پالیسی کو واپس پھیر دے۔ اسلامی دنیا میں اتحادی حکومتوں کو جو استثنائی حیثیت دی گئی ہے یہ اب امریکی خارجہ پالیسی کا حصہ نہ رہے گی۔ اس کے بجائے حقوقِ انسانیت اور دوسرے شفاف اصولوں کو آگے بڑھانا اور اصلاحات ہی امریکہ کے ایجنڈے کے لازمی حصے قرار پائیں گے۔ یہ ایک مسلسل موضوع ہوگا جس کو سفارتی تبادلۂ خیالات میں اٹھایا جاتا رہے گا اور یہ امریکی کانگریس کی تحقیق وجستجو کے عمل کا عنوان بن جائے گا اور امریکہ کے امدادی پروگراموں کا مرکزی حصہ بن جائے گا۔

ایسا کرتے ہوئے اس کا امکان موجود ہے کہ امریکہ اپنے اتحادیوں کو دباؤ میں لے آئے اور انہیں اپنے سے دور کر دے، اس وقت جب اسے ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہو۔ داخلی سلامتی کا وہ انتظام ہے جو عموماً جابر حاکموں کے اقتدار کو سنبھالا دیے رکھتا ہے، اس کی امریکہ کو بطور ہتھیار، دہشت گردوں کی بیخ کنی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر شام دہشت گردی کے خلاف مہم میں امریکہ کا ایک کلیدی اتحادی ہے لیکن وہاں کسی صورت میں بھی ایک نمائندہ حکومت قائم نہیں ہے۔ اس طرح خطے میں

عراق کی جابر حکومت کے خلاف دیگر مستبد حکومتوں کی حمایت حاصل کرنا بھی نہایت اہم اور نازک معاملہ ہے۔ ایسی صورت میں انتہائی چابکدست سفارت کاری بھی ان مسائل کے ایجنڈے کا احاطہ کرنے کے قابل نہ ہوگی۔

اس وقت جمہوری عمل ایک غیر مستقل اور غیر یقینی عمل ہے۔ تاریخ نے دیکھا ہے کہ موثر منتخب حکومتوں تک کا عبوری دور تکلیف دہ حد تک سست رفتار ہے اور اکثر راستہ سے انحراف میں پرتشدد جھگڑوں کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اگلا مسئلہ یہ ہے کہ انتہا پسندی کے رجحان سے بچ کر اور اسلام پسند انقلابیوں کو حصولِ اقتدار سے روکنے کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ بعض صورتوں میں مثلاً پاکستان میں انتخابات نے انتہا پسند اسلامی گروہوں کے سامنے روک لگا دی ہے۔ اور بعض صورتوں میں مثلاً الجیریا میں یہ خطرات پائے جاتے ہیں کہ انقلابی نئی کھلی راہوں کو استعمال کر کے اقتدار حاصل کر لیں گے، بلکہ سارے نظام کو ہی اغوا کر لیں گے۔

مزید برآں، سیاسی آزادی کے باوجود اغلب امکان یہ ہے کہ اسلامی ملکوں میں سیاسی منظر نامے کی تشکیل میں امریکیت کے شدید مخالفین (Anti Americanism) کی وراثت نمایاں کردار ادا کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو نفاذِ جمہوریت کے کسی بھی عمل میں وہ حکومتیں خطرے کی زد میں ہوں گی جنہیں امریکہ کے قریبی حلیفوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مخالف گروہ ممکن ہے اس موضوع کو استعمال کر کے امریکہ کی حلیف حکومتوں کا تختہ الٹ دیں اور اس طرح حکومتوں کو امریکہ سے مل کر کام کرنے سے روک دیں۔

ایک اور اہم چیلنج یہ ہے کہ کس طرح پرانی حزبِ اختلاف سے بننے والی نئی حکومتوں سے مفید گفت و شنید کی فضا پیدا کی جائے؟ کئی ممالک میں اسلام پسند سیاسی پارٹیاں کوئی واضح مدمقابل نہیں رکھتیں اور جمہوری تجربہ کے عمل سے گزرتے ہوئے اقتدار حاصل کرنے کی توقع رکھتی ہیں۔ اس لیے امریکہ کو ان طاقتوں سے میل جول پیدا کرنا چاہیے تاکہ نہ صرف ان کے ساتھ مثبت تعلقات قائم ہو سکیں بلکہ ان کے نظریات میں بھی امریکہ کے بارے میں اعتدال پیدا کیا جا سکے۔ ان اقدامات کو اپناتے ہوئے امریکہ کو اپنی حلیف مستبد حکومتوں کے اعتراضات کو نظر انداز کرنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ ایسی گفت و شنید دیکھنا پسند نہ کریں گی۔ مساویانہ طور پر امریکی سفارت کاروں کے لیے لازم ہوگا کہ

وہ اسلام پسند پارٹیوں سے مل کر کام کرنا سیکھیں۔ اس کے ساتھ ہی زیادہ لادینی قوتوں سے بھی بطورِ مستقبل کے شریک کار، نہ کہ بحیثیت مخالفین، دوستانہ روابط قائم کریں۔

نفاذِ جمہوریت اور اصلاحات سے متعلق ایسے سوالات امریکہ کے اپنے اتحادیوں سے تعلقات کے ضمن میں نہ صرف نہایت اہم ہیں بلکہ یہ اس امریکی وراثت سے بھی مطابقت رکھتے ہیں جو وہ اسلامی خطوں میں اپنے ملٹری آپریشنز کے بعد چھوڑنا چاہتا ہے۔ افغانستان میں بھی امریکہ قومی تعمیر وترقی کے کاموں سے اس لیے احتراز کرتا رہا ہے کہ مبادا وہ مقامی سیاست میں ملوث ہو کر اپنی عسکری قوت کے غلط استعمال پر مجبور ہو جائے۔ یہ پالیسی افغانستان میں طویل المیعاد استحکام کے امکانات کے بارے میں اور ممکنہ جنگِ عراق کے بعد کے حالات کے بارے میں بڑے اندیشے اور تفکرات سامنے لاتی ہے۔

امریکہ کی عظیم فوجی برتری اس کا اہم ترین اثاثہ ثابت ہو سکتی ہے، لیکن یہ ان طویل المیعاد سکیورٹی چیلنجوں کا مکمل حل نہیں ہے جن کا امریکہ کو سامنا ہے (یا جس طرح ایک آسٹروی شہزادے کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کہا تھا: ''تم سنگینوں سے بہت کچھ کر سکتے ہو لیکن ان پر بیٹھ نہیں سکتے'')۔ اسلامی دنیا کو جو تشویش لاحق ہے وہ یہ ہے کہ اب جبکہ امریکہ نے افغانستان میں ایک بڑی فتح کا تجربہ حاصل کر لیا ہے اور امکان اغلب ہے کہ آگے چل کر وہ عراق میں حاصل کر لے گا، یہ ابھی تک غیر واضح ہے کہ آیا اس نے بعد از جنگ سیاسی دائرے میں بھی اپنے کام کا کوئی واضح خاکہ تیار کیا ہے کہ نہیں؟

اہم ترین امریکی مفادات کے حصول اور تبدیلی کی ضرورت کے مابین جو کھنچاؤ ہے وہ امریکی پالیسی میں پیچیدگی کو جاری رکھے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امریکہ کوئی ایسی راہ تلاش کرے جس پر چل کر وہ اصلاحات کے لیے معتدل آوازوں اور رواداری کی حوصلہ افزائی بھی کرے اور انہیں مدد بھی دے۔ اور غیظ وغضب کے ان ماخذوں کو جو انقلابیوں کو شہ دیتے ہیں، نیست و نابود کر دے۔ اس وقت امریکہ کو دہشت گرد قوتوں کے خلاف اس رواں جنگ میں فوری کارروائی کرنی چاہیے جو اسلام کے اندر بھی جاری ہے۔ امریکہ اس مسئلے کا جو حل نکالے گا اسی پر آئندہ نسلوں تک امریکہ کے مسلم دنیا کے ساتھ تعلقات کا انحصار ہو گا۔

امریکہ اور اسلامی تحریکیں — اصلاحات کا چیلنج

امریکی خارجہ پالیسی کے لیے ایک اور مرکزی چیلنج یہ ہے کہ کس طرح خطرے کی زد میں آئی ہوئی ریاستوں میں معتدل اسلامی اور سول سوسائٹی کی قوتوں کو مدد دی جائے۔ انتہا پسند اسلامی قوتیں اکثر ان محدود تعداد والے گروہوں پر چھا جاتی ہیں جو ریاست کے باہر کام کرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر اس حقیقت کا نتیجہ ہے کہ انتہا پسندی عدم استحکام ہی میں پروان چڑھتی ہے، جبکہ مساجد ایسا محفوظ اور پرامن ماحول فراہم کرتی ہیں جہاں سول معاشرہ حکومت کی مداخلت سے آزاد رہ کر خود کو منظم کرتا ہے۔

اسلامی دنیا میں سول معاشرہ کی تعمیر ضروری ہے کیونکہ یہ ایک مستبد حکومت اور انتہا پسندی کا متبادل پیش کرتا ہے۔ اگر مقامی کرداروں کے لیے نئی جگہ مہیا کی جائے تو زمینی سطح پر مثبت ترقیاتی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایسی تنظیموں کی مدد سے ایسا اولین دائرہ کار سامنے آئے گا جہاں تبدیلی کے لیے مدد دی جا سکے گی۔ مقامی سول معاشرہ کے گروہوں کی مدد کے لیے امریکی کاوشیں اس کے لیے نیک اور اچھے جذبات کے ذخائر تعمیر کر ڈالیں گی۔

چیلنج یہ ہے کہ امریکہ کس طرح بڑے نتائج و عواقب سے محفوظ رہتے ہوئے اسلامی دنیا میں سول معاشرے کی افزائش میں مدد دے؟ پہلا کام جائز مقامی سول معاشرے کے گروہوں کو بحیثیت شراکت کار تسلیم کرنا ہے یعنی وہ گروہ جو بیرونی امداد و حمایت کو مطلوبہ مقصد کے لیے بروئے کار لائیں۔ بدعنوانی اور امدادی منصوبوں کی بدانتظامی کے علاوہ اسلامی دنیا کی بہت سی مقبول سول معاشرے کی قوتیں اپنا الگ ایجنڈا رکھتی ہیں جو ہمیشہ مغربی ترجیحات سے موافقت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر یہی گروہ جو قابل قدر اور عوام دوست خدمات مہیا کرتے ہیں مثلاً مفت علاج معالجہ کی سہولتیں اور غرباء کو خوراک کی فراہمی وغیرہ، وہ حقوقِ نسواں کے معاملے میں مخصوص حد بندیوں کے قائل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے قابل گروہ اپنی سرزمین پر بعض ایسی اقدار کی پاسداری کرتے ہیں جنہیں بعض امریکی عطیہ دہندگان لعنت قرار دیتے ہیں۔

ایک اور مسئلہ امریکی امداد کے ساتھ اکثر در آنے والے منفی اثرات کا ہے۔ امریکی امداد دہندگان

امریکی ساکھ پر تو ضرور توجہ دیتے ہیں لیکن وصول کنندگان پر اس کے حقیقی اثرات کا کم ہی جائزہ لیتے ہیں، امریکی امداد بعض اوقات اپنے ساتھ ''بدنامی'' لے آتی ہے جس کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بیشتر مسلم ممالک میں سول معاشرہ کو مدد کی ضرورت ہوسکتی ہے، لیکن یہ مدد اس کے امداد دہندگان کی ترغیبات کے بہت زیادہ قریب ہونے کی قیمت پر نہیں ہوسکتی۔ امریکہ کو لازماً یہ یقین کرنا ہوگا کہ مثبت تبدیلی کے لیے مقامی قوتوں کی مدد اس طرح کی جائے کہ نہ تو امریکہ کو بے جا مداخلت کار سمجھا جائے اور نہ ہی امداد وصول کرنے والوں پر امریکی ایجنٹ یا امریکہ نواز ہونے کا الزام لگایا جاسکے۔ امریکہ کو اس سے خاص طور پر بچنا چاہیے کہ اس کو کہیں اس طرح نہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی شرائط کے تحت اسلام کی نئے سرے سے تعریف متعین کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تعلیمی اصلاحات کو ایک بڑی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی دنیا کی بساط پر بہت سے تعلیمی نظام اپنے حلقوں میں ناکام ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر کامیابی کے تمام معیارات —— شرح خواندگی اور سائنسی کارنامے، وغیرہ عالمی معیار سے بہت نیچے ہیں جن میں خاص طور پر جنسی عدم مساوات بہت نمایاں ہے۔ نتیجتاً اسلامی دنیا میں معاشی منظر نامے کا مستقبل دھندلا دکھائی دیتا ہے۔

پاکستان میں گزشتہ چند عشروں میں پبلک سکول سسٹم بہت ابتر ہو گیا ہے اور پاکستانی نوجوانوں کو اسلامی مذہبی سکولوں میں، جنہیں 'مدرسہ' کہتے ہیں، تعلیم دلانے کے حق میں دست بردار ہو گیا ہے۔ ان مدرسوں کی اپنی صدیوں پر پھیلی ایک عظیم الشان تاریخ ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ مدرسے اصلاً مسلمان علماء کی تربیت کے لیے قائم کیے گئے تھے نہ کہ عام وسیع آبادیوں کے لیے۔ یہ مدرسے پہلے پاکستان میں چند سو کی تعداد میں تھے اب ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی ہے۔ یہ پرائمری تعلیم کے ایک اہم حصے کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک کلیدی نکتہ یہ ہے کہ یہ مدرسے نادار طلبہ کے لیے مفت طعام و قیام جیسی سماجی فلاحی خدمات بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ریاست کا چھوڑا ہوا خلاء پر کرنے سے یہاں طلبہ بھی بڑی تعداد میں آتے ہیں اور انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ پھر بھی ان سکولوں کا نصاب رٹی رٹائی مذہبی تربیت تک ہی محدود ہے۔ نتیجتاً یہ ہر سال ایسے فارغ التحصیل پیدا کرتے ہیں جو جدید دنیا کے لیے بمشکل ہی موزوں ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان مدرسوں کی ایک چھوٹی سی

اقلیت ایسی بھی ہے جس کے روابط خطرناک عسکری گروہوں کے ساتھ ہیں۔ ان مدرسوں سے ان کو اپنی کارروائیوں کے لیے بڑے تسلسل کے ساتھ رنگروٹ بھی مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ موجودہ نظام تعلیم ایک طرف تو پہلے ہی سے کشمکش میں مبتلا پاکستانی اقتصادیات کو زک پہنچاتا ہے اور دوسری طرف خطے میں عدم استحکام اور تشدد برقرار رکھنے والا ایک عامل بھی ہے۔

اسلامی دنیا میں مقامی اندرونی اصلاحات میں معاونت کے سلسلے میں یہ مدارس انتہائی پیچیدہ پالیسی چیلنج پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے تعلیم ایک داخلی سیاسی موضوع ہے جو خود مختار پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ مزید برآں یہ مدارس غیر حکومتی مذہبی سکول ہیں، جو قابل فہم طور پر اسلام کا اندرونی معاملہ ہے۔ ان کو بند کر دینا گویا فتنہ و فساد کا دروازہ کھولنا ہے جبکہ دوسرے متبادل سکول جو امریکی امداد سے چل رہے ہیں ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ امریکی اقدار اور کلچر کو فروغ دے رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نہ صرف ان مدارس کا عام غلبہ امریکہ کے ایک قریبی اور اہم اتحادی کے لیے چیلنج کا درجہ رکھتا ہے بلکہ یہ مدارس وسیع تر مسلم آبادیوں کی ضروریات پوری کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دہشت گرد گروہوں کو مدد دیتے ہیں جو امریکی مفادات کو ہدف بناتے ہیں، اس طرح یہ بعض براہِ راست قسم کے خطرات کو سامنے لاتے ہیں۔

امریکہ کے حکومتی اور بہت سے غیر حکومتی ادارے نہ صرف تعلیمی امداد کو فروغ دینا چاہتے ہیں بلکہ انسدادِ دہشت گردی کے وسیع تر پروگرام کے ایک حصے کے طور پر بین الثقافتی مکالمے اور اقتصادی پیش رفت کے بھی خواہاں ہیں۔ پاکستانی مدارس کے معاملے میں جو تشویش ناک مسائل سامنے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا ہونا کتنا مشکل ہوگا۔ دوسرے ممالک میں امداد دینے والوں کو امداد اور کسی ملک میں بے جا مداخلت کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچنا ہوگا۔

پرانے مسائل اور نئے خطرات: اسرائیل۔فلسطین وغیرہ

گیارہ ستمبر کے حملے کسی بھی پہلو سے اسرائیلی فلسطینی تنازعہ کا نتیجہ نہیں تھے۔ درحقیقت القاعدہ نے حال ہی میں یہ کوشش کی ہے کہ وہ اس تنازعہ سے فائدہ اٹھائے۔ اس سے قبل یہ گروہ فلسطینی مسئلہ سے دور

ہی رہا۔ اسامہ بن لادن کی اہم ترین تقاریر کا موضوع امریکہ اور اس کی خلیج میں موجودگی تھی۔ ان میں فلسطینی گروہوں کے ساتھ روابط یا ان کی امداد کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ اسرائیلی فلسطینی تنازعہ سے بڑھ کر کوئی موضوع امریکہ اور دنیائے اسلام کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتا، نہ امریکی حکمت عملی کے لیے ایسی سنگین نوعیت کی الجھنیں پیدا کرتا ہے۔

امریکہ نے اسرائیل کے ساتھ جو تعلقات استوار کر رکھے ہیں وہ اس کے اسلامی ممالک سے تعلقات کے مقابلے میں زیادہ امتیازی نوعیت کے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسرائیلی فلسطینی تنازعہ کی اونچی ہوتی ہوئی سطح پر مشرق وسطیٰ اور دیگر ممالک کے ساتھ امریکی تعلقات میں تلخی پیدا ہو جائے۔ جہاں تک ان اسلامی ممالک کا تعلق ہے جو ہزاروں میل دور واقع ہیں مثلاً انڈونیشیا اور ملائیشیا وغیرہ جن کا فلسطینیوں سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، ان میں بھی اسلام اور امریکہ کے حوالے سے کوئی بحث ایسی نہیں ہوتی جس میں اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کا تذکرہ نہ ہو۔ یہ ممالک یقینی طور پر مداخلت میں دلچسپی نہیں رکھتے لیکن ان میں جو غم وغصہ اور شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں وہ امریکہ کی وسیع پالیسیوں پر سایہ فگن رہتے ہیں۔

امریکہ اور اسرائیل آپس میں ایک طویل اور انتہائی قریبی دوستی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اسرائیل کو جو ہر دم دہشت گردی کا سامنا رہتا ہے اس سے امریکہ اس پر دلی ہمدردی رکھتا ہے۔ اسرائیل کو امریکہ کی جو سیاسی ومعاشی امداد حاصل ہے اسی کی بدولت اس نے غربی کنارے پر قبضہ کیا ہوا ہے اور وہاں یہودی بستیاں بسا رہا ہے۔ اسی لیے امریکہ کو فلسطینیوں اور آگے بڑھ کر مسلمانوں کے خلاف ایک جانبدار کھلاڑی کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر مسلمان ریاستوں اور ان کی تحریکات کی طرف سے احساس علیحدگی امریکی پالیسی سازوں کے لیے ایک بڑا چیلنج پیش کرتی ہے۔ اسرائیل سے اتحاد اور اسلامی دنیا میں ایک مثبت تصور قائم رکھنا، اس دوطرفہ دباؤ کے بین بین چلنا امریکی پالیسی سازوں کے لیے مشکل ترین مسائل ہیں۔

بہت سی اسلامی ریاستوں کی داخلی سیاست میں تبدیلیاں اسی پالیسی چیلنج کا ایک نہایت اہم حصہ ہیں۔ ان میں نسلی تبدیلی کا کردار اہم ہے۔ اسلامی دنیا کے طول وعرض میں آبادیوں میں نوجوانوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ روایتاً نوعمر گروہ عدم استحکام کا ایک بڑا سبب ہیں۔ ان گروہوں کو مسلم ممالک

پہلے ہی سے اپنے زبوں حال سیاسی و معاشی ڈھانچوں میں نہیں سمو سکتے اس لیے ان کی یہ ناکامیاں بڑے خطرات پیدا کر رہی ہیں۔ مزید برآں یہ نئی نسل اسلامیت (Islamization) میں روز افروں اضافے اور تشدد کے دور میں جوان ہوئی ہے اور اس کا امریکہ سے اتحاد اور دوسری مابین طاقتوں مثلاً عرب قوم پرستی کی طویل تاریخ میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

بیشتر مسلم راہنما اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسرائیلی فلسطینی کشمکش اور اس معاملے میں ان کی بے عملی، جس کے بارے میں ان کی آبادی کی غالب اکثریت میں تفکرات پائے جاتے ہیں، ایسی صورت حال ہے جو ان کی داخلی سیاست کو زہر آلود کر رہی ہے۔ یہ نہ صرف ان کے نوجوان طبقے میں حد درجہ غم و غصہ پیدا کر رہی ہے بلکہ حکومتوں کی اندرونی کمزوری کو بھی ظاہر کر رہی ہے، جو نہ اندرون خانہ موثر ہے نہ باہر۔ اس وقت اسرائیل مخالف اور عملاً امریکہ مخالف عوامی جذبات میں روز افزوں تناؤ، نیز دہشت گردی اور عراق کے خلاف مدد کے لیے امریکی مطالبات اور اس کے ساتھ مقامی حکومتی اداروں کی نااہلی وہ عوامل ہیں جن کی بنا پر اسلامی دنیا میں وسیع تر امریکی اسٹریٹجک مقاصد سے یہاں کی حکومتوں کے تصادم کا خطرہ موجود ہے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ اسرائیلی فلسطینی تشدد کا دوبارہ ابھرنا اور آبادیوں میں تبدیلی ایک ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں میڈیا کے اداروں میں اضافہ ہوا ہے۔ بہت سی ریاستوں میں کئی طرح کے مقامی اور بین الاقوامی خبر رساں اداروں نے خبروں کی منڈی میں حکومتی اجارہ داری کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح انہوں نے پبلک فورم پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ الجزیرہ سیٹلائیٹ ٹیلی وژن نیٹ ورک، جو بلا مداخلت عربی نقطۂ نظر سے خبریں پیش کرتا ہے، ایک سیٹلائٹ ڈش کے ساتھ ہر کسی کی رسائی میں ہے۔ یہ مثال میڈیا کے اس پھیلاؤ کا احاطہ کرتی ہے۔

اسلامی دنیا میں معلومات کے نئے ذرائع کے پھیلاؤ نے عوامی بحث و تمحیص کے لیے بڑے میدان پیدا کر دیے ہیں، مگر سخت پیشہ ورانہ مقابلے اور اسرائیل میں مسلسل تشدد سے ان ذرائع نے یہ دیکھ لیا ہے کہ مبالغہ آرائی پیشہ ورانہ صحافت کی حدود کا پابند رہنے کے مقابلے میں زیادہ موثر اور منافع بخش ہے۔ حقیقتاً مسلم منڈیوں اور معاشروں میں امریکی ذرائع ابلاغ (میڈیا) کا مدمقابل پیدا ہو رہا ہے جس میں

مذاکروں اور خبروں کے پروگراموں میں واضح طور پر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور دانستاً غیظ و غضب کے جذبات برانگیختہ کیے جاتے ہیں (جن کا رخ امریکہ کی طرف ہوتا ہے) بجائے اس کے کہ وہ ایک کھلا فورم مہیا کریں۔

اس کا نتیجہ ایک ایسے خطرناک ماحول کی پیدائش کی صورت میں رونما ہو رہا ہے جس میں غیر مطمئن اور کبیدہ خاطر نوجوان بھڑکائے جا رہے ہیں، حکومتیں کمزور ہیں، ہر قسم کے ذرائع ابلاغ، (اخبارات، ٹی وی، ریڈیو چینلز) دھماکہ خیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں اور تشدد کی روزانہ کی خوراک فلسطینی انتفاضہ کی صورت میں نمودار ہو چکی ہے۔ یہ سب مل کر امریکہ مخالف جذبات میں اور بھی زیادہ اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ رجحان اتحادی حکومتوں کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ امریکہ سے دہشت گردی یا عراق کے خلاف یا اسرائیل کے ساتھ مساعی امن کی حمایت میں تعاون کرنے کے لیے اپنی پالیسیوں کی تشکیل کریں۔ اس نے اسلام پسند پارٹیوں کے لیے عوامی تائید و حمایت کو حیاتِ نو عطا کر دی ہے، دہشت گردی کی کچھ صورتوں کو قانونی حیثیت دے دی ہے اور بہت سی حکومتوں کے قیام کے قانونی جواز کو جزواً ختم کر دیا ہے۔

اس طرح امریکہ کو مربوط مسائل کے ایک لمبے سلسلے کا سامنا ہے۔ وہ کس طرح اسلامی ملکوں سے جن کی القاعدہ کے خلاف جنگ میں اسے مدد کی ضرورت ہے، اپنے تعلقات خراب کیے بغیر اسرائیل کی مدد کرے اور سویلین آبادی کے خلاف دہشت گردی کی مخالفت کرے؟ وہ اسلامی دنیا میں کس طرح ایک کھلے اور آزاد میڈیا کی حمایت کرے جبکہ اسے معلوم ہے کہ یہ میڈیا اس کی کوششوں پر تباہ کن اثر ڈالتا ہے (جہاں ایک مرتبہ امریکہ نے حکومتی مداخلت سے آزاد نئے ابلاغی نیٹ ورکس کی افزائش کی حمایت کی تھی، اور حال ہی میں اس کو ان حکومتوں سے درخواست کرنی پڑی کہ وہ ان کو لگام دیں)۔ آخر میں یہ کہ وہ کس طرح معتدل مسلم حکومتوں اور سول سماجی قوتوں کی حمایت کرے جو اسرائیل کے ساتھ امن کے قیام کے لیے کام کر رہی ہیں، بغیر اس خطرے کے کہ ان پر امریکی مطالبات کی جبین سائی کا الزام آئے۔

یہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ امن کے عمل کا احیاء اور اسرائیلی فلسطینی تشدد کا خاتمہ نہ صرف اپنے طور پر مثبت ثابت ہوگا بلکہ یہ اسلامی دنیا سے امریکہ کے وسیع تر تعلقات میں موجودہ مسائل کے حل میں بھی مدد ثابت ہوگا۔ اس سے مقامی حکومتوں پر دباؤ کم ہو جائے گا اور پورے خطے میں امریکہ کی مخالفت میں بھی کمی

آئے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ اپنے دوسرے مقاصد اور مفادات کو قربان کیے بغیر کس طرح اس راستے کو اختیار کیا جائے؟

بدمعاش ریاستیں، مشرقِ وسطیٰ، اور اسلامی دنیا

اگرچہ زیادہ زور اور توجہ ان مخصوص ریاستوں پر دی جاتی ہے جو بدمعاش ریاستیں ہیں یا برائی کے محور میں ہیں، مثلاً عراق اور ایران، تاہم اسلامی دنیا کے ساتھ زیرِ سطح تناؤ ان ریاستوں میں بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے جو امریکہ کی اتحادی ہیں۔

امریکی پالیسی سازوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں پالیسی رکھنا ایسا ہی ہے جیسے اسلامی دنیا کے بارے میں پالیسی رکھنا۔ ممکن ہے ماضی میں اتنا کافی ہو مگر اب اتنا کافی نہیں۔ مختصر یہ کہ امریکہ پالیسی کی توسیع کے مسئلے سے دوچار ہے: وہ کس طرح ان مسلمانوں کے مسائل سے نمٹے جو وہاں نہیں رہتے جو روایتاً اسلامی ریاستیں سمجھی جاتی ہیں اور اکثر اس کی اتحادی بھی ہیں؟

جب اسلامی دنیا کے بارے میں کوئی پالیسی بنائی جاتی ہے تو بعض اہم قسم کی شماریات اکثر نظرانداز کر دی جاتی ہیں۔ عرب لوگ مسلمانوں کی کل تعداد کے پانچویں حصے سے بھی کم ہیں۔ درحقیقت سب سے اونچی اور سب سے زیادہ آبادی والی چار ریاستیں (انڈونیشیا، پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش) تو مشرقِ وسطیٰ کے اندر واقع نہیں ہیں۔ مزید برآں مسلمانوں کی ایک تہائی سے زیادہ تعداد تو غیر مسلم ممالک میں بطور اقلیت رہتی ہے (بشمول چین، فرانس، بھارت، فلپائن اور امریکہ)۔ صرف بھارت تیرہ کروڑ مسلمانوں کا وطن ہے۔ نتیجتاً مشرقِ وسطیٰ بالعموم اور بعض بدمعاش ممالک بالخصوص امریکی پالیسی مفادات کے لیے اہم تو ضرور ہیں لیکن وہی سب کچھ نہیں ہیں۔ اگر امریکہ اسلامی دنیا سے مثبت تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنی پالیسیوں کی زیادہ وسیع حد بندی کرنی ہوگی۔

مثال کے طور پر، مسلم اقلیتوں اور ان حکومتوں سے جو ان سے برا سلوک روا رکھتی ہیں، کس طرح تعلقات قائم کیے جائیں؟ یہ فوری توجہ طلب مسئلہ ہے۔ اقلیتی مسلم گروہوں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ روز بروز متحرک ہو رہے ہیں۔ یہ وسیع تر اسلامی دنیا سے زیادہ بہتر طور پر مربوط ہیں۔ عالمی ذرائع

ابلاغ میں اضافے اور عالمی نظام میں اسلام کے مقام پر وسیع تر بحث کے سبب ان کی حالتِ زار کے بارے میں حساسیت نمایاں ہوتی رہی ہے۔

عالمگیریت کی وجہ سے ممالک کی سرحدیں کھلنے کے ساتھ ہی مسلم اقلیتوں کے روابط نہ صرف وسیع تر اسلامی دنیا کے ساتھ قائم ہوئے ہیں بلکہ وہ عالمی برادری کا حصہ بھی بن گئی ہیں۔ امت کے ایک حصے کا درد ساری امت میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اس لیے دنیا کے مختلف خطوں مثلاً فلپائن، بلقان یا چیچن کے سنکیانگ میں مسلم اقلیتوں کے تفکرات عالمِ تنہائی میں نہیں ہیں۔ اس کے بجائے یہ پُرخطر تنازعات کا مرکز بن سکتے ہیں جو دوسرے خطوں سے انتہاپسندوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں اور جواب میں بدامنی اور تشدد کو باہر برآمد بھی کر سکتے ہیں۔ افغان جنگ سے مجاہد رضا کاروں کی دیگر خطوں مثلاً الجزائر، بوسنیا، چیچنیا، انڈونیشیا، فلپائن اور تاجکستان کی طرف عالمی حرکت پذیری سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح تشدد ایک خطے سے دوسرے خطوں میں پھیل سکتا ہے۔

جیسا کہ گیارہ ستمبر کے حملوں سے واضح ہوا ہے، حتیٰ کہ مستحکم اور خوشحال ممالک میں بھی مسلمانوں کی غالب غیر مسلم معاشرے سے علیحدگی اور تنہائی کے نتائج عالمی تشویش کا باعث بن سکتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے اغوا کنندگان کا ایک نمایاں اور مشترک وصف یہ تھا کہ اگرچہ وہ سب عربی پس منظر رکھتے تھے لیکن ان کی انتہاپسندی اور تنظیم بنیادی طور پر مغربی دنیا میں پروان چڑھی۔ شبہ ہے کہ (ان حملوں) کی زیادہ تر منصوبہ بندی اس وقت ہوئی جب وہ ہیمبرگ، جرمنی میں مسلم اقلیتوں کے مہمان تھے۔

القاعدہ اور کچھ بدمعاش ممالک کے مابین مبہم تعلقات کے برعکس یہ امر مصدقہ ہے کہ اس تنظیم کی دیگر شاخیں امریکہ کے قریبی غیر مسلم اتحادیوں مثلاً سپین، اٹلی یہاں تک کہ خود امریکہ کے اندر بھی مصروف کار ہیں۔ لہٰذا امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو معلوم کرنا چاہیے کہ کیسے ان زیرِ سطح مسائل سے نمٹا جائے جو نہ صرف پاکستانی مدارس بلکہ برسلز کی مساجد، برمنگھم کی بستیوں، برطانیہ کے گلی کوچوں یا نیویارک کے پرانے فولادسازی کے قصبوں میں اسلامی انتہاپسندی کے لیے کشش پیدا کرتے ہیں۔

اس ادراک کا اطلاق کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کوئی ایک فرنٹ لائن نہیں، ہمارے ملک [امریکہ] کی سلامتی پر بھی ہوتا ہے۔ القاعدہ کی حکمت عملی بظاہر یہ ہے کہ غیر مطمئن مسلم اقلیتوں میں

سے بھرتی کر کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے روایتی نظام کو عاجز کر دیا جائے۔ جوتے کے اندر بم رکھنے والا رچرڈ ریڈ برطانیہ میں نمودار ہوا۔ جبکہ جوز پیڈیلا جو ''گندہ بمبار'' بننے جا رہا تھا، بروکلین میں پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا پرانے طور طریقوں کے باوجود یہ امکان موجود ہے کہ مستقبل کے انقلابی اسلامی دہشت گرد عام مشتبہ لوگ نہ ہوں گے (یعنی عرب لوگ جن کے پاس اپنے اصلی وطنوں کے پاسپورٹ ہوتے ہیں)۔

پھر مسلم اقلیتوں کے سیاسی اثرات بھی ہوں گے جن کا القاعدہ سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ اونچی شرح پیدائش اور ترک وطن کے روز افزوں عمل سے چند اگلی نسلوں تک یورپ میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ فرانس میں مسلمان پہلے ہی آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔ جرمنی، برطانیہ اور ہالینڈ میں بھی یہ کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ تاہم یہ مسلمان آپس میں متحد و مربوط نہیں ہیں اور شدید قسم کے معاشی و معاشرتی مسائل اور تفرقہ بازی کا شکار ہیں۔

اگر حالیہ رجحان جاری رہا اور نوعمر مسلمان الگ تھلگ رہے تو انتہا پسند اسلام کو سارے براعظم میں زیادہ زرخیز زمین میسر آ جائے گی۔ کیونکہ یہ ریاستیں امریکہ کی قریبی حلیف ہیں، اس سے امریکہ کی خارجہ پالیسی کے لیے سلسلہ در سلسلہ چیلنج پیدا ہوں گے۔ اگر یورپ کی سرزمین پر تبدیلی رونما ہو جائے تو اس کے بحرالکاہل پار تعلقات پر کیا مضمرات ہوں گے؟ کیا یورپ کے مسلمان یورپی حکومتوں کو امریکہ کے ساتھ بعض مخصوص مسائل پر زیادہ قریب رہتے ہوئے کام کرنے دیں گے، کیونکہ انہیں ایک مشترکہ خطرے کا سامنا ہے؟ یا پھر وہ ان اتحادیوں کو اس خوف سے دور دھکیل دیں گے کہ خود ملک کے اندر سے مختلف طرح کے ردِعمل کا خطرہ ہے؟ اپنے روایتی حلیفوں کی طرف امریکہ کی پالیسیاں اور لائحہ عمل کس طرح تبدیل ہونے چاہییں اگر ان کے اندر اسلامی گروہوں کو ترجیح حاصل ہو؟ اہم نکتہ یہ ہے کہ اس عالمگیریت والی دنیا میں امریکہ کی اسلامی دنیا کی جانب پالیسی بدمعاش ریاستوں سے نمٹنے اور شرقِ اوسط کا احاطہ کرنے سے کچھ زیادہ ہی ہونی چاہیے۔

نئی سرد جنگ

دہشت گردی کے خلاف جنگ امریکی پالیسی سازوں اور امریکی پبلک کے لیے دنیا کے بارے

میں نقطۂ نظر کا ایک نمونہ بن گئی ہے۔ چونکہ امریکہ کو ملک کے اندر یقینی حمایت حاصل ہے اس لیے خارجہ پالیسی کے ایک زیادہ وسیع ایجنڈے کو دہشت گردی کے خطرے سے منسلک کرنا، اسے کسی مخالفت کے بغیر بروئے کار لانے کا جواز بن گیا ہے۔ درحقیقت القاعدہ کا خطرہ ہمارے زمانے کا سرخ خطرہ بن سکتا ہے۔ ایک حقیقی چیلنج، مگر ایسا جس کو دوسرے مقاصد کے تعاقب میں مسخ کیا جاسکتا ہے۔ ایک اہم ترین اسٹریٹجی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے امریکہ کو ایسی توانائی اور فوکس عطا کیا ہے جو زمانہ مابعد سرد جنگ کی بیزاری والی کیفیت میں کمیاب تھا۔ لیکن ایسے شیشوں سے دیکھنا جو صرف خطرات ہی دکھاتے ہوں اور مواقع نہ دکھاتے ہوں، نقصان دہ بھی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی راہنمائی کے لیے فوجی لائحہ عمل کا ڈھانچہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جو امریکہ کو نامناسب کام کرنے پر مجبور کردے۔

یہ تذبذب کہ اگلی بار دہشت گردی کے خلاف امریکی افواج کہاں بھیجی جائیں اس مسئلہ کی توضیح کرتا ہے۔ مقامی حکومتوں کے متنازعہ علاقوں مثلاً فلپائن میں جزیرۂ منڈے ناؤ اور جارجیا میں پریولیکا وادی میں مقامی حکومتوں کے محدود حفاظتی کنٹرول کی بدولت امریکہ کے تفکرات میں اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کو فکر اس بات کی ہے کہ یہ کمزور ریاستی رقبے جو افغانستان سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں، بین الاقوامی دہشت گردی کے اڈوں کے طور پر استعمال ہوسکتے ہیں۔

امریکہ کی مقامی جھگڑوں میں بڑھتی ہوئی مداخلت سے الٹے نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ جب امریکی افواج وہاں بھیجی جاتی ہیں تو وہ بین الاقوامی دشمنوں کا صفایا تو کرسکتی ہیں لیکن ساتھ ہی وہ مقامی کردار میں اپنے نئے دشمن بھی پیدا کرسکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لڑائی پھیل جائے۔ مقامی حکومت بھی امریکی امداد پر اس حد تک انحصار کرنے لگے کہ اس کی اپنی افواج اپنی صلاحیتیں کھونے کے ساتھ ہی اپنے شہریوں کے نزدیک اپنی عزت و توقیر بھی کھودیں۔ حتمی طور پر یہ کہ اس وسیع رسائی والی پالیسی سے ساری اسلامی دنیا میں امریکی شہنشاہیت کا رینگتا ہوا سایہ بڑھتا اور ترقی کرتا محسوس ہوگا جس کے نتیجے میں ایک شدید ردعمل رونما ہوگا اور امریکی پبلک ڈپلومیسی کے دوسرے پہلوؤں کے بھی خلاف ہوگا۔

یہ خطرہ کہ قومیں امریکی اسٹریٹجی کو اپنے مقاصد کے لیے ڈھال کر فائدہ اٹھاسکتی ہیں محتاط رہنے کی ایک دوسری وجہ ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد بہت سی حکومتیں اس قابل ہوگئی ہیں کہ وہ مقامی دشمنوں سے لڑنے

کے لیے، خواہ ان کے القاعدہ سے تعلقات ہوں یا نہ ہوں، امریکہ کو زیادہ سے زیادہ فوجی امداد اور فوجی دستے مہیا کرنے کی ترغیب دیں۔ ایسی کلاسیکی صورت حال نیپال میں پائی جاتی ہے، جسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے امریکی حکومت اب حکومتی فوجی بجٹ کا دس فیصد حصہ مہیا کرتی ہے۔ جبکہ وہ حکومت بجائے بین الاقوامی محرکات رکھنے والی ایک انتہا پسند اسلامی تحریک کے، ایک ماؤ نواز باغی گروہ کے خلاف، جو مقامی زمین کے حقوق کے لیے متحرک ہے، لڑ رہی ہے۔ دوسرے معاملات میں مثلاً ازبکستان، چین کے سنکیانگ اور چیچنیا میں امریکہ نے ان حکومتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں جو اپوزیشن پارٹیوں کو جن کے القاعدہ سے روابط ہوں یا نہ ہوں، نشانہ بنانے کے لیے ایسی چالیں چلتی ہیں جن پر سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں۔

ایسی عظیم حکمت عملی غیر متوازن سرحدی اشتراک کا خطرہ بھی اٹھائے ہوئے ہے۔ امریکہ کو یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کیسے اس کی ابھرتی ہوئی جغرافیائی و سیاسی حکمت عملی، ان ناکارہ حکومتوں کو ان مشکل فیصلوں کے خلاف چلنے کی اجازت نہ دے جو ان کے اپنے مسائل کے حل کے لیے کیے گئے ہوں؟ اس فکر کو نظر انداز کرنے سے امریکی پالیسی اچھی حکومت اور جمہوریت کی تعمیر میں مقامی ناکامیوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہوگی۔

دہشت گردی اور بغاوت میں فرق کرنا بھی اس عمل میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے، جس طرح سرد جنگ کے دوران یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آیا مقامی گوریلا تحریک کمیونسٹ یلغار کا حصہ تو نہیں۔ بعض اسلامی گروہ حقیقی شکایات کو دور کرنے کے لیے برسرِ پیکار ہیں اور ان کا القاعدہ یا امریکہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے مقاصد اکثر سطحوں پر بھلائی کا پہلو بھی لیے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً حکومتی جبر و استبداد کی روک تھام۔ امریکی پالیسی سازوں کے لیے ایک مشکل چیلنج ہوگا کہ انہیں دوسرے دہشت گرد گروہوں سے کس طرح ممیز کیا جائے جو براہِ راست امریکہ مخالف ایجنڈا رکھتے ہیں۔

اب جبکہ اس نکتہ پر امریکہ کی پالیسی الجھاؤ کا شکار ہے، اسے مزید فکر یہ ہے کہ ہوشیار دہشت گرد گروہ اس قابل ضرور ہوں گے کہ وہ امریکی پالیسیوں کے بارے میں مقامی عدم اطمینان کو وسیع تر بین الاقوامی لڑائی بنا لیں۔ اس سلسلے میں القاعدہ کی مثال سامنے ہے جس نے تبدیل ہوتے ہوئے تناظر

سے فائدہ اٹھایا اور اسرائیلی فلسطینی تنازعہ پر غم وغصہ کو اور بھی بھڑکایا اور اس طرح اس نے اس جاری جنگ میں اسلامی دنیا میں عوامی مقبولیت حاصل کر لی۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کی عظیم حکمت عملی کو ترقی دینے سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس طرح امریکی پالیسی سازوں کو جنہیں پیچیدہ خطرے کا سامنا ہے، ایک سادہ سی راہنمائی کا راستہ مل جائے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے جوابات پیدا ہونے کے بجائے مزید سوال پیدا ہو جائیں۔ ایک اہم سوال یہ نہیں ہے کہ اس کے اتحادی کس طرح اس کی مدد کر سکتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ امریکی پالیسی ساز اتحادیوں کو کس طرح یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اس سے ملی ہوئی امریکی فوجی امداد محض مقامی مخالفین کے خلاف کریک ڈاؤن کا بہانہ نہیں بنے گی۔

یہ ابھرتا ہوا اصول اسلامی دنیا میں اور اس سے آگے امریکی اتحادیوں کے لیے بھی ایک نیا چیلنج پیش کرتا ہے۔ اس جنگ میں وہ کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ وہ کہاں تک امریکی نظریات اور اندازوں سے اختلاف کریں گے؟ اگر یہ جنگ امریکہ میں نیکی اور بدی کے مابین جنگ سمجھی جاتی ہے اور امریکہ کے دوست اس میں ملوث ہونے سے ہچکچاتے ہیں تو پھر کیا انہیں ایک طرف ڈال دیا جائے گا؟

اس ضمن میں سرد جنگ کے کچھ اسباق پر نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام ماضی میں جس طرح ایک دوسرے کے مدمقابل رہے تھے اسی طرح دہشت گردی کے خلاف حالیہ جنگ بھی نظریات اور ارادے کی جنگ ہے۔ ماضی کی سرد جنگ، جسے اُس وقت کا واحد خطرہ تصور کیا جاتا تھا، اور موجودہ سوچ کے مابین متوازی خطوط کھینچے جا سکتے ہیں۔ کلیدی مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ کس طرح اس قابل ہو کہ ماضی کی کامیابیوں کا دفاع کرتے ہوئے ماضی کی غلطیوں سے دامن بچائے۔

فیصلہ کی گھڑی

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر حملوں کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہونے کو آ رہا ہے پھر بھی اسلامی دنیا کے لیے امریکی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں کئی پیچیدہ اور فوری فیصلے کرنا باقی ہیں۔ سب سے زیادہ پریشان کن چیلنج جو ابھرتے ہیں وہ اس کے اپنے جانے پہچانے دوستوں اور اتحادیوں کی طرف اس کی پالیسیوں

کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاستوں اور تحریکوں کے لیے خارجہ پالیسی کی تشکیل کے وقت اہم ترین چیلنج جو امریکہ کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ اپنے اہم ترین مفادات کے تعاقب اور ان اصلاحات کو ترقی دینے کی ضرورت کے درمیان، جو پرتشدد انتہا پسندی کی اپیل کو کم کرنے میں مدد دے سکے، کس طرح راہ بنائی جائے۔ امریکہ کی مشکلات میں ان کھینچا تانیوں کی بدولت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ قلیل المیعاد تحفظ کے لیے کیا بہتر رہے گا اور طویل المیعاد استحکام کے لیے کیا ضروری ہوگا۔ دہشت گردی، شخصی حکومت اور استبداد کے خطرات اتحادیوں اور ان کے دشمنوں دونوں کے لیے یکساں ہیں۔ اور یہ بات ان کا مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کی نمو کو مزید پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ بالآخر امریکہ کے پالیسی سازوں کو سابقہ یعنی ماضی کی پالیسی ترجیحات کے ورثہ کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔

آئندہ آنے والے چیلنجوں سے پوری طرح خبردار رہتے ہوئے ان سے نمٹنے کا ایک ایجنڈ الازماً تیار کرنا چاہیے۔ امریکہ کو اسلامی دنیا سے تعلقات کے لیے اپنے مقاصد کے بارے میں ایک مثبت نگاہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ امریکہ کی اکثر بے جوڑ پالیسیوں کو ایک باقاعدہ شکل دی جا سکے بلکہ ایک تعمیری پروگرام بھی پیش کیا جا سکے۔ ایک مربوط اور مثبت نگاہ (بصیرت) پیدا کرنے کا ضمنی اثر یہ ہوگا کہ اس سے اتحادیوں اور دوستوں کی مدد کے لیے ایک ایجنڈا بن سکے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسا پروگرام بھی تشکیل پائے گا جس سے امریکہ کے مخالفین کے نقطہ ہائے نظر کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔

اس کوشش میں مرکزی مفادات، خطرات اور صلاحیتوں کے عمیق تجزیہ کی ضرورت ہے۔ اسلامی دنیا کی جانب امریکی پالیسی میں ایک خصوصی نظر ان مثالی اور ''حتمی مقاصد'' پر ہونی چاہیے جن کا حصول مطلوب ہے: امریکہ اسلامی ریاستوں اور تحریکات کے ساتھ کیسا رشتہ رکھنا چاہے گا؟ ان اسٹریٹیجک مقاصد کی تشکیل کو نیشنل سیکورٹی کونسل اور مناسب بااختیار ایجنسیوں (خارجہ اور دفاع کے محکمہ جات اور انٹیلی جنس کے ذمہ داران بشمول قانون ساز ادارے اور غیر حکومتی ماہرین) کی اعلیٰ سطحوں پر زیر غور لایا جانا چاہیے۔ اعلیٰ سطح کی حمایت کو یقینی بنانے کے لیے اور اس لائحہ عمل کی پائیداری کے لیے حتمی معلومات کو ایک ایسے نیشنل سیکورٹی صدارتی ہدایت نامہ میں جمع کر دیا جائے جس میں اسلامی ممالک اور تحریکات کے ساتھ امریکہ کے

مثبت تعلقات کی استواری کی تفصیل دی گئی ہو۔

آخری منازلِ مقصود کے متعین ہو جانے کے بعد پالیسی ساز زیادہ منظم اپروچ کو ترقی دے سکتے ہیں تاکہ یہ معلوم کرلیا جائے کہ ریاستی تعلقات کے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے امریکہ کہاں تک پیش رفت کرے؟ اور صحیح طریقے سے وہاں تک پہنچنے کے لیے کیا ضروری ہے؟ یہ عمل ٹھوس اقدامات کی وضاحت کا بھی ایک ذریعہ بنے گا جس سے بہت اہم مسائل کو سمجھا جا سکے گا (مثال کے طور پر بعض مرکزی ریاستوں کے اندر امریکہ کی مخالفت کتنی شدید ہے؟ دہشت گردی کے خلاف سرگرمی میں تعاون کی سطح کیا ہے؟ یا سول سوسائٹی کے ساتھ میل جول کس پیمانے پر بڑھا ہے؟)۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوگا کہ امریکہ کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی قدر پیمائی کے لیے ایک منضبط اپروچ مہیا ہو جائے گی بلکہ مستقبل میں صحیح راستے کی طرف راہنمائی بھی میسر آ جائے گی۔

اگر ایسی پروگرامی اپروچ ممکن نہ ہو تو پالیسی سازوں کو کم از کم ایک ایسا پیمانہ (معیار) قائم کرنے کی کوشش شروع کر دینی چاہیے جس پر وہ اپنے فیصلوں کے کم مدتی بمقابلہ طویل مدتی اثرات کی پیمائش کر سکیں۔ غیر حکومتی کرداروں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ خلاء کو پُر کریں اور اپنے حتمی مقاصد کی شناخت کریں اور باقاعدہ ترقی کی رپورٹیں جاری کریں۔

گیارہ ستمبر کا اہم ترین سبق یہ ہے کہ امریکہ اپنے سخت فیصلوں کو اب مزید تعطل میں نہیں رکھ سکتا۔ ان حملوں کے گھمبیر سانحے نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ امریکی خارجہ پالیسی کا معمول کا کاروبار تبدیل کر دیا جائے اور اسلامی دنیا اور امریکہ کے مابین ایک مثبت اور پائیدار تعلق قائم کیا جائے۔ یہ حکمت عملی وضع کرنے میں امریکہ کس طرح یہ مسائل حل کرے گا؟ یہ سوال نہ صرف دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نتیجے بلکہ اس کے حتمی ورثہ کا بھی تعین کرے گا۔

[بی ڈبلیو سنگر امریکہ کے بروکنگز انسٹی ٹیوشن میں فارن پالیسی اسٹڈیز کے ساتھ بطور اولن فیلو (Olin Fellow) وابستہ ہیں۔ آپ "بروکنگز پراجیکٹ آن یو ایس پالیسی ٹوورڈ دی اسلامک ورلڈ" کے کوارڈی نیٹر بھی ہیں]